سحر آثار
امجد اسلام امجد

امجد اسلام امجد

گورا پبلشرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۲۵۔ لوئر مال۔ لاہور

ناشر : طاہر اسلم گورا

GORA PUBLISHERS

۱۹۹۸ء

خطاطی : عبدالمتین
سرورق و پس ورق : ساجد قریشی
اہتمام : اِفتخار احمد
قیمت : ۱۲۵ روپے

زاہد بشیر پرنٹرز۔ لاہور

ملک مُصیب الرّحمٰن

کے نام

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزشتہ بیس برس میں مجھ سے تقریباً ہر انٹرویو میں یہ پوچھا گیا کہ میری ڈرامہ نگاری اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے میری شاعری کی مقدار اور معیار پر کچھ منفی اثر پڑا ہے؟ اور ہر بار میں نے یہی جواب دیا کہ شاعری تو ایک خود رو پودے کی طرح ہوتی ہے جو اپنے اظہار کے لیے سوائے اپنی قوتِ نمو کے کسی اور چیز کی محتاج نہیں ہوتی اور پہاڑی چشمے کی طرح اپنا رستہ خود بنا لیتی ہے۔ سو تمام تر دُنیاوی جھنجھٹوں کے باوجود ان بیس برسوں میں میری شاعری کے پانچ مجموعے شائع ہوئے ہیں اور اوسطاً ایک سال میں میں بارہ سے پندرہ غزلیں اور نظمیں کہہ لیتا ہوں۔ یہ مقدار اگرچہ ابتدائی دو کتابوں کے زمانے سے کچھ کم ہے لیکن پھر بھی اِسے تسلی بخش کہا سکتا ہے البتہ یہ فرق ضرور پڑا ہے کہ اب شعر گوئی کی تحریک میں پڑنے والے وقفے نسبتاً لمبے ہو گئے ہیں۔ بعض اوقات کئی کئی مہینے ایک بھی مصرعے کے بغیر گزر جاتے ہیں۔

لیکن پھر کچھ یوں ہوتا ہے کہ دو دن سے لے کر چار پانچ دن کے دورانیے کی ایک لہر سی آتی ہے اور اُوپر تلے پانچ سات چیزیں ہو جاتی ہیں۔ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے اس کا میرے پاس کوئی منطقی اور شافی جواب نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔

میں ذہنی طور پر اس صورتِ حال کو تقریباً تسلیم کر چکا تھا کہ ایک عجیب و غریب واقعہ ہُوا، ایک ایسا واقعہ جو میری تیس سالہ شعر گوئی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی منفرد اور انوکھا ہے۔

ہُوا یوں کہ "بارش کی آواز" کی اشاعت کے بعد تقریباً دس ماہ پر محیط ایک "دبنجر پن" کا دَور چل رہا تھا جس میں سوائے مرحوم اُستاد نصرت فتح علی خاں کی وفات پر لکھی جانے والی تعزیتی نظم کے شاعری کی ایک سطر بھی لکھی نہ جا سکی تھی کہ اکتوبر ۹۷ء کے آخری ہفتے میں لاہور سے اسلام آباد جاتے ہُوئے طبیعت ایک دم رواں ہو گئی اور آئندہ چار پانچ دِنوں میں تقریباً آٹھ نو چیزیں ہو گئیں۔ گزشتہ تجربے کے مطابق یہ صُورتِ حال معمول کے عین مطابق تھی اور میں ذہنی طور پر اب اس "آمد" کے انقطاع کے لیے تیار ہو چکا تھا مگر دن پر دن گزرتے گئے اور ہر روز کاسۂ سخن میں کچھ نہ کچھ گرتا رہا اور یوں تقریباً ڈیڑھ مہینے میں ایک پوری کتاب کا سامان مکمل ہو گیا۔ اب اگرچہ اس SPELL کو ختم ہُوئے تقریباً دو ماہ ہو چکے ہیں مگر اس تجربے کی خوش گوار حیرت اب بھی میرے چاروں طرف پھیلی ہُوئی ہے، مقدار اور معیار کے باہمی رشتے میں اگرچہ مقدار ہمیشہ

سے معیار کے لیے خطرے کا باعث رہی ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ موجودہ صورتحال میں ایسا نہیں ہُوا۔

اِس مجموعے کا نام "سحر آثار" پہلی نظر میں ممکن ہے کچھ اوپرا اوپرا سا لگے لیکن مجھے یقین ہے کہ جُوں جُوں آپ اس سے مانوس ہوتے جائیں گے یہ آپ کو نہ صرف اچھا لگنے لگے گا بلکہ آپ اسے باقاعدہ پسند کرنے لگیں گے۔

یہ کتاب بھی گورا پبلشرز کے توسط سے آپ تک پہنچ رہی ہے۔ برادرم طاہر اسلم گورا نے ہمیشہ کی طرح اس کی تزئین و آرائش اور پیش کش میں اپنی خوش انتظامی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اس کتاب کے صوری حُسن کا سارا کریڈٹ اُن کو جاتا ہے۔ ترتیب میں حمدیہ غزل، حمدیہ نظم، دو نعتیں، اقبال کے بارے میں لکھی گئی نظم اور مرحوم نصرت فتح علی خاں والی نظم کو اسی ترتیب کے ساتھ بوجوہ ابتدا میں رکھا گیا ہے، باقی کی تمام منظومات زمانی ترتیب کے اعتبار سے ہیں لیکن اس میں جدّت یہ ہے کہ یہ سفر آگے سے پیچھے کی طرف کا ہے یعنی سب سے آخر میں کہی گئی نظم کو پہلا نمبر دیا گیا ہے اور اس دَور کی سب سے پہلی تخلیق آخری نمبر پر ہے۔

B-۹۰ جی۔او۔آر III
شادمان لاہور

امجد اسلام امجد
۲۵ فروری ۹۸ء

حمدیہ غزل

بنتے ہیں ہر سوال کے پیکر نئے نئے
کھلتے ہیں پھول ذہن میں اکثر نئے نئے

کس نے سیاہ رات کو تارے عطا کیے!
پھر ان میں رکھ دیئے کئی چکّر نئے نئے

کرتا ہے کون پھول کو خوشبو سے ہم کنار!
رکھتا ہے کون آنکھ میں منظر نئے نئے

کس قاعدے سے پھیلتی جاتی ہے کائنات!
ذرّوں سے نکلے آتے ہیں جوہر نئے نئے

اِک کہکشاں کے بعد ہے اِک اور کہکشاں!
پھر ان کے بعد بھی مہ و اختر، نئے نئے

نا مختتم سی ریت میں، برفوں کے بیچ بھی
رکھتا ہے کون زیست کے مظہر، نئے نئے!

آنکھوں سے دُور اجنبی پرواز کے لیے
دیتا ہے کون ذہن کو شہپر، نئے نئے!

کیونکر یہ شہر لاکھوں برس پانیوں میں تھے؟
کیسے بنے زمیں پہ سمندر، نئے نئے!

بنتے ہیں رشتے کس طرح چیزوں کے درمیاں!
حدِّ شعور سے کہیں باہر، نئے نئے

روزِ اَزل سے ہیں وہی گنتی کے چند رنگ
بنتے ہیں جن سے اَن گنت، منظر، نئے نئے

ق

ہر چیز کہہ رہی ہے کوئی اور ہے یہاں
جس کی رضا کے فضل ہیں ہم پر، نئے نئے

امجدؔ یہ سب یقیں بھی، سارے گماں بھی
سب ہیں اُسی جمال کے، مظہر، نئے نئے

نظم حمدیہ

جھپک رہے ہیں ستارے جو اپنی آنکھوں کو
طلوعِ صبح کا شاید یہ اِستعارہ ہے
زمین اپنی طرف کھینچتی ہے، مٹی کو
سَفر کی گرد کے اُٹھتے ہیں، بیٹھ جاتے ہیں
جو کوئی غور سے دیکھے تو اِک اشارہ ہے!

ہر ایک چیز نشانی ہے اُس کے ہونے کی
کہ جس نے خاک کے پُتلے کو سرفراز کیا
اِک ایک ذرّے میں سو سو طرح کے بھید رکھے
پھر اپنے راز میں سب کو شریکِ راز کیا

بنا دیئے ہیں زمان و مکان ___ در و دیوار
سروں پہ چھت کی طرح آسماں اُسارا ہے

تمام رستے اُسی کی طرف نکلتے ہیں
کہ دیر ہو یا حرم ! سب پڑاؤ ہیں اُس کے
یہ روز و شب یہ مہ و سال ، جیسے دریا ہیں
جو اُس عمیق سمندر میں جا کے گرتے ہیں
نہیں ہے جس کی کوئی تھاہ ــــ نہ کنارہ ہے !
کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے جیسے ہر لمحہ ،
کسی کی کھوج میں نکلا ہُوا ستارہ ہے !
یہ شش جہات نہیں ، بے شمار آنکھیں ہیں !
یہ کائنات کوئی مستقل نظارا ہے !
ہم اُس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں ، یہ تو برحق ہے
کہیں پہ وہ بھی مگر منتظر ، ہمارا ہے !!

نعت

آپؐ کا نام مانگتا ہوں مَیں
رُوحِ اسلام مانگتا ہُوں مَیں

ہُوں توجّہ کا آپؐ کی طالب
لُطف و اکرام مانگتا ہُوں مَیں

آپؐ کی یاد سے لبالب ایک
دَرد کا جام مانگتا ہُوں مَیں

آپؐ کی پیروی سے ہو منسُوب
ایسا الزام مانگتا ہُوں مَیں

آپؐ کے سایۂ سعادت میں
آخری شام مانگتا ہوں مَیں

دِل رہے مُصطفےٰؐ کے رستے پر
بس یہی کام مانگتا ہوں مَیں

صرف اپنے لیے نہیں امجدؔ
رحمتِ عام مانگتا ہوں مَیں

نعت

کوئی بھی مدح مگر اُس کے حسبِ حال نہیں
وہ ایک شخص کہ جس کی کوئی مثال نہیں

کہ جس کے دیکھے سے آنکھیں حسین ہو جائیں
جہاں میں ایسا کوئی اور خُوش جمال نہیں

نبیؐ کے جُود و سخاوت کی وارث و حقدار
ہے ساری خلقِ خُدا، صرف اُن کی آل نہیں

ہر اک کمال سے آگے کمال ہے تیرا
تیرے خیال سے بہتر کوئی خیال نہیں

نگاہ ایسی کہ رُوحوں میں روشنی بھر دے
کہ جس کے بعد بھٹکنے کا احتمال نہیں

بہت ہی تیز سہی دشمنوں کی تلواریں
جہاں میں اسمِ محمدؐ سی کوئی ڈھال نہیں

جو تیرا دستِ عنایت نہ کر سکے پورا!
کسی فقیر کے کاسے میں وہ سوال نہیں

وہ اُن کے سامنے بولے، کہ یہ جھجک جائے
زباں کو تاب نہیں، آنکھ کو مجال نہیں

بغیر مانگے مُرادیں وہاں سے ملتی ہیں
بیانِ درد نہیں! حاجتِ سوال نہیں!

نہیں ہے کچھ بھی یہاں جو نہ ہو زوالِ آثار
مگر پیامِ محمدؐ! جسے زوال نہیں

مرے تھی بس میں کہاں مدحِ مصطفٰےؐ امجد
یہ نعت اُن کا کرم ہے، مرا کمال نہیں

اقبال

رُوح کو چھُوتے ہُوئے ایک نظارے جیسا
تھا وہ اِک شخص یہاں صبح کے تارے جیسا

فِکر تھی سب سے جُدا، خواب انوکھے اُس کے
پھر بھی لگتا تھا بہر رنگ ہمارے جیسا

پھیلتی جاتی ہے سارے میں وہی بانگِ درا
گُونج ہیں جس کی ہُوا سَیل، کنارے جیسا

شام کی دُھند میں آتا ہے بہت یاد ہمیں
اُس کا چہرہ تھا گھنی شب میں ستارے جیسا

آئیں گے اور بھی دُنیا میں سخن ور لاکھوں
پر نہ ہو گا کوئی اقبال، تمُھارے جیسا

نصرت فتح علی خاں کے لیے ایک نظم

خلا کی وسعتوں میں ہر گھڑی لاکھوں ستارے ٹوٹتے ہیں
اور فنا کا رِزق بنتے ہیں
مگر آنکھیں !
ہماری آپ کی یہ کم نظر، کوتاہ بیں آنکھیں
نہ اُن کو دیکھ سکتی ہیں نہ اُن کو جان پاتی ہیں
بس اِتنا ہے
کہ کچھ ہونے کا اِک بے نام سا احساس رہتا ہے
ستاروں سے ہماری جانکاری بس یہیں تک ہے ۔

مگر ایسا بھی ہوتا ہے
فضا میں دفعتاً اِک روشنی سی پھیل جاتی ہے
کوئی ایسا ستارہ ٹوٹتا ہے
جس کے ہونے سے
شبِ مہتاب کا اور آسماں کا حُسن قائم تھا
زمیں زادے اُسے جب دیکھتے تھے
اُن کی آنکھیں جگمگاتی اور منظر مسکراتے تھے
وہ اُس کو دیکھتے تھے اور چلنا بھول جاتے تھے
ابھی جو ٹوٹ کر بکھرا
وہ ایسا ہی ستارہ تھا
ہماری نصرت و فتح وظفر کا استعارہ تھا

اُسے نغمے سلامی پیش کرتے اور "سرگم" اُٹھ کے ملتی تھی
اُسے وہ سُر بھی آتے تھے جنھیں سُن کر

فرشتے وجد کرتے اور ہوائیں جھوم اُٹھتی تھیں

یہ جتنے ساز ہیں

سب اس کی اُنگلی کے اشارے پر

ہمہ تن راگ بنتے تھے

جو رُوحوں میں سُلگ اُٹھتے

اِک ایسی آگ بنتے تھے!!

ہم لوگ

دائروں میں چلتے ہیں !
دائروں میں چلنے سے
دائرے تو بڑھتے ہیں
فاصلے نہیں گھٹتے !

آرزوئیں چلتی ہیں !
جس طرف کو جاتے ہیں
منزلیں تمنّا کی
ساتھ ساتھ چلتی ہیں !

گرد اُڑتی رہتی ہے
درد بڑھتا جاتا ہے
راستے نہیں گھٹتے!

صُبح دم سِتاروں کی تیز جھلملاہٹ کو
روشنی کی آمد کا پیش باب کہتے ہیں!
اِک کرن جو ملتی ہے، آفتاب کہتے ہیں!
دائرہ بدلنے کو، انقلاب کہتے ہیں!

بارش کے روپ

ہیں ایک بارش کے رُوپ کتنے !
وہی ہے بادل ، وہی گھٹا ہے
یہ راز کیا ہے!
تمام قطرے زمیں پہ اِک ساتھ آ کے گرتے ہیں
پھر بھی سب ایک سے نہیں ہیں !
کہ جیسے نغمہ، بہت سے سازوں سے مِل کے بنتا ہے
اور پھر بھی
تمام سازوں کا اپنا اپنا الگ تشخص ہے
جیسے پیڑوں کے سبز پتّے
کہ سبز ہو کر بھی اپنی رنگت کے ایک حصّے میں
سارے پتّوں سے مختلف ہیں

کبھی جو بارش کی رُت میں آنکھوں کو بند کر کے
مَیں صرف اُس کی نئی نرالی صدائیں سُنتا
اور اُن میں بنتے طرح طرح کے سُروں کو چُنتا ہوں
ایسے لگتا ہے ،
جیسے آہنگِ نو بہ نو کا کوئی دریچہ سا کُھل گیا ہو !!

شجر ، سمندر ، پہاڑ ، وادی — ہَوا کی پائل
اُداس تنہا سڑک ، بیاباں کی ریت ، ساحل !
مکان — اُن کی چھتیں ، دریچے اور اُن کے چھجّے
گلی کی جانب کو کُھلنے والی ہر ایک کھڑکی اور اُس کے شیشے .... !!

ہر ایک شے سے برستی بارش کی گفتگو کا مزا جُدا ہے
نیا ہے الفاظ کا چناؤ ، نرالی بندش ، نوا جُدا ہے
ہر اک سے باتیں الگ الگ ہیں
ہر اِک سے لہجہ جُدا جُدا ہے ،

گھنی اُداسی کی برف جیسے
لہُو کے اندر پگھل رہی ہے!
چراغِ اُمّید کے جَلو میں
ہَوا جُدائی کی چل رہی ہے!
فضا میں وعدے بکھر رہے ہیں
اور آگ، پانی میں جل رہی ہے!!

درد پھیل جائے تو

درد پھیل جائے تو
ایک وقت آتا ہے
دِل، دھڑکتا رہتا ہے
آرزو گزیدوں کے حوصلے نہیں چلتے
دشتِ بے یقینی میں آسرے نہیں چلتے،
رہروؤں کی آنکھوں میں
منزلیں نہ جب تک ہوں، قافلے نہیں چلتے۔!
اِک ذرا توجّہ سے دیکھئے تو کھُلتا ہے

لوگ اِن پہ چلتے ہیں، راستے نہیں چلتے!
سوچنے سمجھنے سے، ساتھ ساتھ چلنے سے
دُوریاں سمٹتی ہیں، فاصلے، نہیں چلتے

خواب خواب آنکھوں میں رتجگے نہیں چلتے!
درگزر کے حلقے میں مسئلے نہیں چلتے!
دو دِلوں کی قربت میں، تیسرا نہیں ہوتا
"واسطے" نہیں چلتے!

بخت ساتھ چلتا ہے، طالع آزماؤں کے
وقت رام کرنے میں، تجزیوں کے داؤ کیا!
تجربے نہیں چلتے
عِشق کے علاقے میں حُکمِ یار چلتا ہے
ضابطے نہیں چلتے

حُسن کی عدالت میں، عاجزی تو چلتی ہے
مرتبے نہیں چلتے

دوستی کے رشتوں کی پرورش ضروری ہے !
سلسلے تعلّق کے، خُود سے بن تو جاتے ہیں
لیکن ان شگوفوں کو ٹوٹنے بکھرنے سے
روکنا بھی پڑتا ہے !

چاہتوں کی مٹی کو، آرزو کے پودوں کو
سینچنا بھی پڑتا ہے !
رنجشوں کی باتوں کو، بھُولنا بھی پڑتا ہے !!

کبھی یُوں بھی ہوتا ہے

کبھی یوں بھی ہوتا ہے
دو اجنبی دل
اچانک کسی خُوشنما موڑ پر
ایک دُوجے سے ملتے ہیں تو ایک لمحہ
اچانک کہیں سے اُبھرتا ہے
اور اُن کی آئندہ عمرُوں کے سارے مہ و سال
پر پھیلتے پھیلتے اُن کے چاروں طرف
اِک بظاہر دکھائی نہ دیتا ہُوا دائرہ سا بناتا ہے
جس کی حدیں گھیر لیتی ہیں اِک دن
ازل سے ابد تک کے سب فاصلوں کو !!

کبھی یوں بھی ہوتا ہے

دو ہم سفر جو ،
زمانوں پہ پھیلی ہُوئی اِک مسافت
کو چاہت کے بادل کے سائے تلے
قدم در قدم کاٹتے جا رہے تھے ،
اچانک کسی اجنبی موڑ پر ایک لمحے کو رُکتے ہیں
تو دیکھتے ہیں
نجانے کدھر سے ہوائے جُدائی کا اِک تیز جھونکا
تعلّق کے سارے دِیوں کو بُجھاتا
دِلوں میں گِلوں کی فصیلیں اُٹھاتا ، بڑھا آ رہا ہے ،
اور اُس کی اُڑتی ہُوئی گرد
لمحوں میں بے شکل کرتی
ہے عمروں پہ پھیلے ہوئے فیصلوں کو !!

○

حد سے توقّعات زیادہ کیے ہُوئے
بیٹھے ہیں دل میں ایک اِرادہ کیے ہُوئے

اِس دشتِ بے وفائی میں جائیں کہاں کہ ہم
ہیں اپنے آپ سے کوئی وعدہ کیے ہُوئے

دیکھو تو کتنے چین سے اِکس درجہ مُطمئن !
بیٹھے ہیں ارضِ پاک کو آدھا کیے ہُوئے

ق

پاؤں سے خواب باندھ کے شامِ وصال کے
اِک دشتِ انتظار کو جادہ کیے ہُوئے!

آنکھوں میں لے کے جلتے ہُوئے موسموں کی راکھ!
گردِ سفر کو تن کا لبادہ کیے ہُوئے

دیکھو تو کون لوگ ہیں! آئے کہاں سے ہیں!
اور اب ہیں کس سفر کا اِرادہ کیے ہُوئے؟

اُس سادہ رُو کے بزم میں آتے ہی بُجھ گئے
جتنے تھے اہتمام، زیادہ کیے ہُوئے

اُٹھے ہیں اُس کی بزم سے امجدؔ ہزار بار
ہم ترکِ آرزو کا اِرادہ کیے ہُوئے!

ہے کوئی نظر والا!

وہ چاند کہ روشن تھا سینوں میں نگاہوں میں،
لگتا ہے اُداسی کا اِک بڑھتا ہُوا ہالہ،
پوشاکِ تمنّا کو،
آزادی کے خلعت کو،
افسوس کہ یاروں نے
اُلجھے ہُوئے دھاگوں کا اِک ڈھیر بنا ڈالا!

وہ شور ہے لمحوں کا، وہ گھور اندھیرا ہے!
تصویر نہیں بنتی، آواز نہیں آتی!
کچھ زور نہیں چلتا، کچھ پیش نہیں جاتی!

اظہار کو ڈستی ہے ہر روز نئی اُلجھن
احساس پہ لگتا ہے ہر شام نیا تالہ،
ہے کوئی دلِ بینا! ہے کوئی نظر والا!!

○

دَر و دیوار ہیں ، مکان نہیں
واقعہ ہے ، یہ داستان نہیں

وقت کرتا ہے ہر سوال کو حل
زیست مکتب ہے امتحان نہیں

ہر قدم پر ہے اِک نئی منزل
راستوں کا کہیں نشان نہیں

رنگ بھی زندگی کے مظہر ہیں
صرف آنسو ہی ترجمان نہیں

دِل سے نکلی ہُوئی صدا کے لیے
کچُھ بہت دُور آسمان نہیں

کل کو ممکن ہے اِک حقیقت ہو
آج جس بات کا گمُان نہیں

شور کرتے ہیں ٹوٹتے رشتے
ہم کو گھر چاہیئے مکان نہیں

خواب، ماضی! سراب، مستقبل!
اور جو "ہے" وہ میری جان "نہیں"

اِتنے تارے تھے رات، لگتا تھا
کوئی میلہ ہے آسمان نہیں

شاخِ سدرہ کو چھُو کے لوٹ آیا
اِس سے آگے مری اُڑان نہیں

یوں جو بیٹھے ہوئے تعلّق سے
کیا سمجھتے مری زبان نہیں ؟

کوئی دیکھے تو موت سے بہتر
زیست کا کوئی پاسبان نہیں

اِک طرف میں ہوں اِک طرف تم ہو
سلسلہ کوئی درمیان نہیں

○

کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا گیا پھر نظر نہیں آیا

وفا کے دشت میں رستہ نہیں مِلا کوئی
سوائے گردِ سفر، ہم سفر نہیں آیا

پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صُبح کا بھُولا مگر نہیں آیا

کِسی چراغ نے پُوچھی نہیں خبر میری
کوئی بھی پھُول مِرے نام پر نہیں آیا

چلو کہ کوچۂ قاتل سے ہم ہی ہو آئیں
کہ نخلِ دار پہ کب سے ثمر نہیں آیا !

خُدا کے خوف سے جو دل لرزتے رہتے ہیں
اُنھیں کبھی بھی زمانے سے ڈر نہیں آیا

کدھر کو جاتے ہیں رستے، یہ راز کیسے کھُلے
جہاں میں کوئی بھی بارِ دگر نہیں آیا

یہ کیسی بات کہی شام کے ستارے نے
کہ چَین دل کو مرے رات بھر نہیں آیا

ہمیں یقین ہے امجد نہیں وہ وعدہ خلاف
پہ عمُر کیسے کٹے گی ، اگر نہیں آیا

○

ہم تو اسیرِ خواب تھے تعبیر جو بھی تھی
دیوار پر لکھی ہُوئی تحریر جو بھی تھی

ہر فرد لاجواب تھا، ہر نقش بے مثال
مل جُل کے اپنی قوم کی تصویر جو بھی تھی!

جو سامنے ہے، سب ہے یہ، اپنے کیے کا پھل
تقدیر کی تو چھوڑیئے، تقدیر جو بھی تھی

آیا اور اِک نگاہ میں برباد کر گیا
ہم اہلِ انتظار کی جاگیر جو بھی تھی

قدریں جو اپنا مان تھیں، نیلام ہوگئیں
ملبے کے مول بک گئی تعمیر جو بھی تھی

طالب ہیں تیرے رحم کے ہم عدل کے نہیں
جیسا بھی اپنا جُرم تھا، تقصیر جو بھی تھی

ہاتھوں پہ کوئی زخم نہ پیروں پہ کچھ نشاں
سوچوں میں تھی پڑی ہُوئی، زنجیر جو بھی تھی

یہ اور بات چشم نہ ہو معنی آشنا
عبرت کا ایک درس تھی، تحریر جو بھی تھی

امجدؔ ہماری بات وہ سُنتا تو ایک بار
آنکھوں سے اُس کو چُومتے، تعزیر جو بھی تھی

○

منظر کے اِرد گِرد بھی اور آر پار دُھند
آئی کہاں سے آنکھ میں یہ بے شمار دُھند!

کیسے نہ اُس کا سارا سفر رائیگاں رہے
جس کاروانِ شوق کی ہے رہگزار دُھند!

ہے یہ جو ماہ و سال کا میلہ لگا ہُوا
کرتی ہے اِس میں چُھپ کے مِرا انتظار دُھند

آنکھیں وہ بزم، جس کا نشاں ڈولتے چراغ
دل وہ چمن، کہ جس کا ہے رنگِ بہار دُھند

کمرے میں میرے غم کے سوا اور کچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار دُھند

فردوسِ گوش ٹھہرا ہے مبہم سا کوئی شور
نظّارگی کا شہر میں ہے اعتبار، دُھند

ناٹک میں جیسے بکھرے ہوں کردار جا بجا
امجد فضائے جاں میں ہے یوں بے قرار دُھند!

زیبندہ بیٹی کے لیے ایک نظم

بیس برس کی بات ہے لیکن یوں لگتا ہے
جیسے کل کی بات ہو، جب وہ
ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر مجھ کو چھوتی، میری جانب آتی تھی تو
اُس کے لبوں پر ایک ستارہ کِھلتا تھا،
میری رُوح کی ساری خوشبو اور سچّائی
اُس کے لمس میں جاگ اُٹھتی تھی
اللہ — ! کیسے اچھے دن تھے!!

اب میں اُس کی پیاری پیاری
پھولوں جیسی زیبندہ کو چھوتا ہوں تو

یوں لگتا ہے

جیسے سب کچھ لوٹ آیا ہو

جیسے اُس نے میری خاطر

اپنا بچپن دوہرایا ہو !

مولا — جیسے تُو نے میری عرض سُنی اور

اپنے جاری فیض سے میرے من کو شانت رکھا

مُجھ پر اور اِک رحمت فرما

زیبندہ کو اُس کی ماں کی خُوشبو دے کر

عاقب اور روشین کی دُنیا

پہلے سے بھی روشن کر دے

اِس تازہ معصوم ہنسی سے

اُن کے سارے گھر کو بھر دے!!

—

○

اُداسی میں گھِرا تھا دِل چراغِ شام سے پہلے
نہیں تھا کچھ سرِ محفل چراغِ شام سے پہلے

حُدی خوانو، بڑھاؤ لَے، اندھیرا ہونے والا ہے
پہنچنا ہے سرِ منزل چراغِ شام سے پہلے

دِلوں میں اور ستاروں میں اچانک جاگ اُٹھتی ہے
عجب ہلچل، عجب جھِل مِل چراغِ شام سے پہلے

وہ ویسے ہی وہاں رکھی ہے، عصرِ آخرِ شب میں
جو سینے پر دھری تھی سِل، چراغِ شام سے پہلے

ہم اپنی عُمر کی ڈھلتی ہُوئی اِک سہ پہر میں ہیں
جو مِلنا ہے ہمیں تو مِل، چراغِ شام سے پہلے

ہمیں اے دوستو اب کشتیوں میں رات کرنی ہے
کہ چُھپ جاتے ہیں سب ساحل، چراغِ شام سے پہلے

سَحر کا اوّلیں تارا ہے جیسے رات کا ماضی
ہے دن کا بھی تو مُستَقبِل، چراغِ شام سے پہلے

نجانے زندگی اور رات میں کیسا تعلّق ہے!
اُلجھتی کیوں ہے اِتنی گِل چراغِ شام سے پہلے

محبّت نے رگوں میں کس طرح کی روشنی بھر دی!
کہ جل اُٹھتا ہے امجدؔ دِل، چراغِ شام سے پہلے

○

آنکھوں کا رنگ ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا !

کچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے پہ نقش
پھر یوں ہُوا کہ خُود مرا چہرا بدل گیا

جب اپنے اپنے حال پہ ہم تم نہ رہ سکے
تو کیا ہوا جو ہم سے زمانہ بدل گیا

قدموں تلے جو ریت بچھی تھی وہ چل پڑی
اُس نے چھڑایا ہاتھ تو صحرا بدل گیا

کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی
جاتے ہی ایک شخص کے کیا کیا بدل گیا!

اِک سرخوشی کی موج نے کیسا کیا کمال!
وہ بے نیاز، سارے کا سارا بدل گیا

اُٹھ کر چلا گیا کوئی وقفے کے درمیاں
پردہ اُٹھا تو سارا تماشا بدل گیا

حیرت سے سارے لفظ اُسے دیکھتے رہے
باتوں میں اپنی بات کو کیسا بدل گیا

کہنے کو ایک صحن میں دیوار ہی بنی
گھر کی فضا ، مکان کا نقشہ بدل گیا

شاید وفا کے کھیل سے اُکتا گیا تھا وہ
منزل کے پاس آ کے جو رستہ بدل گیا

قائم کسی بھی حال پہ دُنیا نہیں رہی
تعبیر کھو گئی ، کبھی سپنا بدل گیا

منظر کا رنگ اصل میں سایا تھا رنگ کا
جس نے اُسے جدھر سے بھی دیکھا بدل گیا

اندر کے موسموں کی خبر اُس کو ہو گئی!
اُس نو بہارِ ناز کا چہرا بدل گیا

آنکھوں میں جتنے اشک تھے جگنو سے بن گئے
وہ مُسکرایا اور مری دُنیا بدل گیا

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ
امجدؔ یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا

○

آنکھوں کو التباس بہت دیکھنے میں تھے
کل شب عجیب عکس مِرے آئنے میں تھے

سارے دھنک کے رنگ تھے اُس کے لباس میں
خُوشبو کے سارے اَنگ اُسے سوچنے میں تھے

ہر بات جانتے ہُوئے دِل مانتا نہ تھا
ہم جانے اعتبار کے کِس مرحلے میں تھے

وصل و فراق دونوں ہیں اِک جیسے ناگزیر
کچھ لطف اُس کے قرب میں، کچھ فاصلے میں تھے

سیلِ زماں کی موج کا ہر وار سہہ گئے
وہ دن، جو ایک ٹوٹے ہُوئے رابطے میں تھے!

غارت گری کے بعد بھی روشن تھیں بستیاں
ہارے ہُوئے تھے لوگ مگر حوصلے میں تھے!

ہر پھر کے آئے نقطۂ آغاز کی طرف
جتنے سفر تھے اپنے کسی دائرے میں تھے

آندھی اُڑا کے لے گئی جس کو ابھی ابھی
منزل کے سب نشاں اُسی راستے میں تھے

چھُو لیں اُسے کہ دُور سے بس دیکھتے رہیں!
تارے بھی رات میری طرح، مخمصے میں تھے

جُگنو، ستارے، آنکھ، صبا، تتلیاں، چراغ
سب اپنے اپنے غم کے کِسی سلسلے میں تھے!

جتنے تھے خط تمام کا تھا ایک زاویہ
پھر بھی عجیب پیچ مرے مسئلے میں تھے

امجدؔ کتابِ جاں کو وہ پڑھتا بھی کِس طرح!
لکھنے تھے جتنے لفظ، ابھی حافظے میں تھے

○

ظاہر شمال میں کوئی تارا ہُوا تو ہے
اِذنِ سفر کا ایک اِشارا ہُوا تو ہے

کیا ہے! جو رکھ دیں آخری داؤ میں نقدِ جاں!
ویسے بھی ہم نے کھیل یہ ہارا ہُوا تو ہے

وہ جانے، اُس کو خیر خبر ہے بھی یا نہیں!
دل ہم نے اس کے نام پہ وارا ہُوا ہے

پاؤں میں نارسائی کا اِک آبلہ سہی
اِس دشتِ غم میں کوئی ہمارا ہُوا تو ہے

اُس بے وفا سے ہم کو یہ نسبت بھی کم نہیں
کچھ وقت ہم نے ساتھ گزارا ہُوا تو ہے

اپنی طرف اُٹھے نہ اُٹھے اُس کی چشمِ خوش!
امجدؔ کسی کے درد کا چارا ہُوا تو ہے!

○

اُلجھن تمام عُمر یہ تارِ نفس میں تھی!
دِل کی مُراد عاشقی میں یا ہوس میں تھی!

دَر تھا کھُلا، پہ بیٹھے رہے پَر سمیٹ کر
کرتے بھی کیا کہ جائے اماں ہی قفس میں تھی!

سَکتے میں سب چراغ تھے، تارے تھے دم بخود!
مَیں اُس کے اختیار میں، وہ میرے بس میں تھی

اَب کے بھی ہے، جمی ہُوئی، آنکھوں کے سامنے
خوابوں کی ایک دُھند جو پچھلے برس میں تھی

کل شب تو اُس کی بزم میں ایسے لگا مجھے!
جیسے کہ کائنات مِری دسترس میں تھی

محفل میں آسمان کی بولے کہ چُپ رہے
امجدؔ سدا زمین اسی پیش و پس میں تھی

سب کی اِک اوقات — "عشق نہ پُوچھے ذات"

بالکل بھُول گئے — کرنی تھی کیا بات

سَستا کر دے گی — زر کی یہ افراط!

اَب سے تیرے ہیں — میرے دن اور رات

سچّے جذبوں سے — مہنگی ہو گئی دھات

اب کے خُوب ہوئی — بِن موسم برسات

کٹ ہی جاتی ہے — کیسی بھی ہو رات!

باسی ہوتی جائے — دل میں رکھّی بات

کچّی ڈور، میاں! — کب تک دیتی ساتھ!

گرہیں کھولے گا — جانے کب وہ ہاتھ!

تجھ کو چاہوں مَیں   کیا میری اوقات!
کیسے اُجڑ گئے ؟   خوابوں کے باغات

(ق)

وقت سمندر میں   ایک سے ہیں دن رات
آگے گہری کھائی   پیچھے ہے ظُلمات!

غم کے دھاگوں سے   امجدؔ خوشیاں کات!

○

زمین جلتی ہے اور آسمان ٹوٹتا ہے،
مگر گریز کریں ہم تو مان ٹوٹتا ہے!!

کوئی بھی کام ہو انجام تک نہیں جاتا!
کسی کے دھیان ہیں پل پل یہ دھیان ٹوٹتا ہے

کہ جیسے متن میں ہر لفظ کی ہے اپنی جگہ
جو ایک فرد کٹے، کاروان ٹوٹتا ہے

نژادِ صبح کے لشکر کی آمد آمد ہے
حصارِ حلقۂ شب زادگان ٹوٹتا ہے

اگر یہی ہے عدالت! اور آپ ہیں مُنصِف!
عجب نہیں جو ہمارا بیان ٹوٹتا ہے

وفا کے شہر کے رستے عجیب ہیں امجدؔ
ہر ایک موڑ پہ اِک مہربان ٹوٹتا ہے

خلافِ قانون

لوگ کہتے ہیں پانی میں لکڑی نہیں ڈوبتی !
اور وجہ یہ بتاتے ہیں
لکڑی کا اپنا حجم
چونکہ پانی کی اِتنی ہی مقدار کے
بالمقابل زیادہ نہیں !
اِس لیے وہ سدا
سطحِ آبِ رواں پہ رہے گی مگر
ڈوبنے کا عمل اُس پہ ہوگا نہیں

اَزل سے یہ قدُرت کا قانون ہے ،
اور قانونِ قدُرت بدلتا نہیں !!

پہ میں سوچتا ہوں
اگر یہ حقیقت میں قانون ہے
تو ترے غم کے دریا میں
دِل کیسے ڈوبا ؟

○

کہتا ہے درپن — میرے جیسا بن !
تاریکی کی موت! — ایک نحیف کِرن
محنت اپنا مال — وقت، پرایا دُھن
بات نہ کرنے سے — بڑھتی ہے اُلجھن
اپنے دِل جیسا ! — کوئی نہیں دشمن
دُنیا۔ ! لَوٹا دے — میرا اپنا پن
جھولے جی اُٹھے — جاگ پڑے جامن
روز وہی قِصّہ! — روز وہی اُلجھن !
صدیاں ٹُوٹ گئی — پائل کی چھَن چھَن
یہ تو برسے گا — ساون ہے، ساون!

سارے خاک سمان　　تَن اور مَن اور دَھن

اپنوں ہی سے تو　　ہوتی ہے اَن بَن

سب سے اچھّا ہے　　اپنا گھر آنگن !

پیاس بڑی ہے یا　　سونے کا برتن ؟

کیا اُفتاد پڑی!　　لگتا ناہیں مَن

آدم زاد نہیں،　　بستی ہے یا بَن !

کیسا بھی ہو رُوپ!　　مٹّی ہے مدفن

سکّے کے دو رُخ　　برہن اور دُلہن

دھوکہ دیتے ہیں　　اُجلے پیراہن

راہ میں کِھلتا پھُول　　بیوہ کا جوبن

دونوں جھُوٹے ہیں　　ساجن اور ساون

آہٹ کس کی ہے　　تیز ہُوئی دھڑکن

اُتنی خواہش کر　　جتنا ہے دامن

ہم تم دونوں ہیں　　دھرتی اور ساون

عکس بنے کیسے؟ دُھندلا ہے درپن

زیرِ آب ہُوئے خوابوں کے مسکن
ٹھہر گیا ہے کیوں! آنکھوں میں ساون!

(ق)

کچّا سونا ہی بنتا ہے کُندن
اِک دِن نکھرے گا سچّا ہے گر، فن!
کیسے روک سکے! خُوشبو کو گلشن

امجدؔ میرے ساتھ
اَب تک ہے بچپن!

ساتھ تو اجنبی بھی چلتے ہیں

اُس نے مجھ سے کہا
مرے ساتھی !
تُم کو مجُھ سے جو ہے گِلہ ــ کیا ہے !
کبھی فرصت ملے تو یہ سوچو ،
منزلیں کیوں ہے ؟ فاصلہ کیا ہے ؟

اپنے اپنے سَفر پہ نِکلے لوگ
مشترک راستوں پہ چلتے ہیں
ہمرہی کے حصار میں جتنے
دِن نکلتے، چراغ جلتے ہیں!
سب کی آنکھوں میں جِھلملاتے ہیں
اپنی اپنی اُمید کے دَر و بام
زندگی کے سَفر میں ملتے ہیں
مستقل درد، عارضی آرام!

تُم مِرے ہم سفر تو ہو لیکن
ہم کہیں سے بچھڑ بھی سکتے ہیں!
دیر تک اِک طویل رستے پر
ساتھ تو اجنبی بھی چلتے ہیں!!

آخرِ شب

کہیں نہیں ہے اِشارہ کسی بھی آہٹ کا
وہی ہے درد ، وہی انتظارِ آخرِ شب !

ہَوا گزُرتی ہے گلیوں سے شرمسار سی کچھ
کہ آج بھی کوئی خُوشبو نہیں وہ لا پائی !
ستارے دشتِ فلک میں بکھرتے جاتے ہیں
دِلوں میں پھیلتی جاتی ہے ایک تنہائی !

تنی ہے دائرہ در دائرہ وہ تاریکی ،
کسی طرف کو کوئی راستہ نہیں جاتا !
زمیں سے کون کہے اب کہ ہم سے بات تو کر،
رگوں کو توڑ نہ ڈالے کہیں یہ سنّاٹا !!

کہیں سے صبح کی پہلی کرن ملے، تو چلے
کھڑا ہے وقت سرِ رہگذارِ آخرِ شب !
کہیں نہیں ہے اشارہ کسی بھی آہٹ کا
وہی ہے درد ، وہی انتظارِ آخرِ شب !

———

○

کسی ترنگ، کسی سرخوشی میں رہتا تھا
یہ کل کی بات ہے، دل زندگی میں رہتا تھا

کہ جیسے چاند کے چہرے پہ آفتاب کی لَو
کھُلا کہ میں بھی کسی روشنی میں رہتا تھا

سرشتِ آدمِ خاکی، ذرا نہیں بدلی!
فلک پہ پہنچا مگر، غار ہی میں رہتا تھا

کہا یہ کس نے کہ رہتا تھا میں زمانے میں
ہجومِ درد، غمِ بے کسی میں رہتا تھا

ق

کلام کرتا تھا قوسِ قزح کے رنگوں میں
وہ اِک خیال تھا اور شاعری میں رہتا تھا

گُلوں پہ ڈولتا پھرتا تھا اوس کی صُورت!
صدا کی لہر تھا اور نغمگی میں رہتا تھا

نہیں تھی حُسنِ نظر کی بھی کچھ اُسے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

وہاں پہ اب بھی ستارے طواف کرتے ہیں
وہ جس مکان میں، جس بھی گلی میں رہتا تھا

بس ایک شام بڑی خامشی سے ٹُوٹ گیا
ہمیں جو مان ، تری دوستی میں رہتا تھا

کِھلا جو پھُول تو برباد ہو گیا امجدؔ
طلسمِ رنگ مگر غنچگی میں رہتا تھا

اُلجھن

وہ ایک سوچا ہُوا ناز سا تکلّم میں
نظر میں ایک جھجک سی کوئی بنائی ہُوئی

لبوں پہ ایک تبسّم ذرا لجایا سا
جبیں پہ بزمِ مروّت سجی سجائی ہُوئی

ڈھکا ڈھکا سا تکبّر وہ بات سُننے میں!
تھی جس میں حُسن کی نازش کہیں چھپائی ہُوئی

بدن میں خوف کی لرزش بھی، اور دعوت بھی!
گُریز کرتی ہُوئی اور قریب آئی ہُوئی

کچھ اُس کو دیکھ کے کھُلتا نہ تھا کہ کیا ہے وہ!
فریب دیتی ہُوئی یا فریب کھائی ہُوئی!!

○

سب دیکھتے تھے اور کوئی سوچتا نہ تھا
جیسے یہ کوئی کھیل تھا، اِک واقعہ نہ تھا!

لکھتے بیاضِ وقت پہ ہم کیا تاثرات
سب کچھ تھا درج اور کوئی حاشیہ نہ تھا

آپس کی ایک بات تھی، دونوں کے درمیاں
اے اہلِ شہر آپ کا یہ مسئلہ نہ تھا!

تیری گلی میں آئے تھے بس تجھ کو دیکھنے!
اِس کے سِوا ہمارا کوئی مدّعا نہ تھا

تھے ثبت حُکمِ ہجر پہ اُس کے بھی دستخط
تقدیر ہی کا لکھّا ہُوا فیصلہ نہ تھا

اِک سمت پاسِ عشق تھا، اِک سمت اپنا مان
کیسے گُریز کرتے! کوئی راستہ نہ تھا!!

امجدؔ یہ اقتدار کا حلقہ عجیب ہے
چاروں طرف تھے عکس کوئی آئنہ نہ تھا

اے ربِّ غفّار!

ایک سوال کے اندر ہم نے کاٹی نصف صدی،
باندھے لاکھ حساب،
غلط ہی نکلا ہر اک حل کا لیکن انت جواب!

ضرب، جمع، تقسیم کے سارے کُلیے برت لیے
از رُوئے تحقیق
ہر کوشش میں ہو جاتا ہے کچھُ نہ کچھُ تفریق

دیکھ تو کتنا اُونچا ہے یہ ردّی کا انبار
تُو ہی اب کچھُ رحمت کر دے اے ربِّ غفّار!

○

جب تک رستے جائیں　　یوں ہی چلتے جائیں
آئینوں سے کیوں ؟　　عکس ٹکرتے جائیں!
آنکھیں ہیں آباد !　　خواب اُجڑتے جائیں
ایسی آندھی میں !　　خاک سنورتے جائیں!!
اپنی سوچوں سے　　آپ ہی ڈرتے جائیں
عکس کریں تو کیا　　نقش بگڑتے جائیں
جلتی آنکھوں میں　　سپنے بُجھتے جائیں
جتنا دُھتکارے　　اور لپٹتے جائیں
رو لیں خُود پر ہی　　کچھ تو کرتے جائیں!

ق

بیٹھے بیٹھے ہی　　ہاتھ نہ ملتے جائیں
ایک چراغ سہی　　راہ میں دھرتے جائیں
سچّی بات لکھیں　　جب تک لکھتے جائیں

جو کچھ بس میں ہے وہ تو کرتے جائیں
رزمِ ہستی سے لڑتے لڑتے جائیں
مُردہ مٹی کو زندہ کرتے جائیں
جب تک زندہ ہیں آگے بڑھتے جائیں

ق

آؤ ہم اور تُم ایسا کرتے جائیں
آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتے جائیں
باتوں باتوں میں غُنچے کِھلتے جائیں
رنگوں میں رنگلیں خوشبو ہوتے جائیں
اُمّیدیں پُھوٹیں خدشے مرتے جائیں

امجدؔ سب کے دل
اور نکھرتے جائیں

وہ دن اَب کچھ دُور نہیں

وہ دن اب کچھ دُور نہیں ،
جب آپس میں کرنے والی سب باتیں بھی
انٹرنیٹ پر ہوں گی ،
جذبے ـــــ نقطوں اور لکیروں کی بولی میں بات کریں گے
لفظوں کی امداد لیے بن
اِک دُوجے کے خواب اور خدشے پڑھ پائیں گے ،
دھاگا دھاگا خاموشی سے اپنے گیت اور خواب بُنیں گے ،
خُوشبو دیکھیں، رنگ سُنیں گے !!

وہ دِن اب کچھ دُور نہیں !
وقت سمندر کی لہروں میں تنہا تنہا چلنے والے

INTERNET ∴

جسموں کی آواز کو سُن کر اِک دُوجے کی سمت بہیں گے
پَل دو پَل کی وحشت میں اِک ساتھ رہیں گے
اور پھر ایسے ہو جائیں گے ،
جیسے یہ صحبت ہی اُن کے جیون بھر کا سرمایہ ہو
جس سے اگلے وقتوں والے
نسل ، قبیلے ، قوم وغیرہ کی پہچانیں کرتے تھے اور
مِل کر جیتے مرتے تھے !

وہ دن اب کچھ دُور نہیں !
ہر اک بات اُدھوری ہو گی
ایک ہی گھر کے دو کمروں میں
لاکھوں میل کی دُوری ہو گی
ردّی کا انبار سا ہوں گے جتنے رشتے ناتے ہیں
چاند نگر کی سیر کو خلقت ایسے آتی جاتی ہو گی
جیسے اب ہم بازاروں میں شاپنگ کرنے جاتے ہیں

SHOPPING :٭

وہ دن اب کچھ دُور نہیں !
جب اِک سوچ اور ایک ہی جیسی شکلوں والے، آدم زادے
آدم زاد تو شاید ہوں گے
لیکن اُن کی شخصیت کے سارے جوہر
آنکھوں اور بالوں کی رنگت ،
خوشیاں ، محفل، تنہائی ،
فکر، تدبّر ، دانائی
شعر ، غِنا ، تصویر
مستقبل میں آنے والے لمحوں کی تقدیر
سب کچھ اُن کے جینز[*] کے اَندر حسبِ ضرورت شامل ہوگا
ساری باتیں اَزبر ہوں گی ، ہر اِک فعل مکمّل ہوگا

وہ دن اب کچھ دُور نہیں !
اِنسانی جسموں کے اعضا ،

[*] GENES

فالتو پُرزوں کی صُورت میں شو کیسوں میں رکھّے ہوں گے
(جینوئن بھی اور دو نمبر بھی)
تیسری دُنیا کے دل والے
پہلی دُنیا کے لوگوں کی آنکھیں اوڑھ کے نکلیں گے تو
سُورج اَندھا ہو جائے گا!
آقاؤں کے سینوں میں جب محکوموں کے دِل دھڑکیں گے
سب کچھ اُلٹا ہو جائے گا

وہ دن اَب کچھ دُور نہیں —!
جب آنکھوں سے اوجھل منظر بالکل صاف نظر آئیں گے!
آئینوں میں عکس کے بدلے نمبر جلتے بجھتے ہوں گے
لوگ مشینیں بن جائیں گے،
تخمینوں کے بیش و کم میں ہر اِک چیز اضافی ہو گی
جُرم بنیں گے پیار، محبّت! دِل کی موت، تلافی ہو گی

GENIUNE :.

دُھند جمے گی سینوں میں اور برف اُگے گی پیڑوں پر
رو بوٹوں سے ملتے جُلتے نقش بنیں گے چہروں پر
ایک ہی وقت میں جن کی آنکھیں
آگے پیچھے دیکھ سکیں گی
کان ، سمندر کے نیچے کی آوازیں پہچان سکیں گے
تاروں کے اُس پار ہے کیا کیا !
یہ بھی شاید جان سکیں گے !

وہ دن اب کچُھ دُور نہیں — !
جب یہ سب کچُھ "ہونے والا"
ہو جائے گا
رات ابھی تک باقی ہو گی اور اُجالا ہو جائے گا
ہر اِک خواب اور ہر اِک جذبہ ،
ماضی کے مرحوم دنوں کا ایک حوالہ ہو جائے گا۔

کل کے آدم کے ہاتھوں میں ہر اِک قفل کی کُنجی ہو گی
لمحے اُس کے چاکر ہوں ہر اک ساعت باندی ہو گی
دستِ ہُنر کی فنکاری سے، عقل کی روشن مشعل سے
دُنیا ویسی ہو جائے گی، جیسی اُس نے سوچی ہو گی!!

یہ تو سب کچُھ ہو جائے گا، پھر بھی دل یہ کہتا ہے!
"یہ جو چاروں سمت ہمارے، وقت کا دریا بہتا ہے
کیا ہے اِس کے آگے پیچھے؟ کیوں ہے یہ اور کب سے ہے؟
کس کے حُکم سے چلتا ہے اور کس کی کھوج میں رہتا ہے؟
جو کچُھ ہم نے جان لیا ہے ـــ یہ تو ہے تحقیق!
اپنی اصل میں لیکن چیزیں کس کی ہیں تخلیق؟
کِس نے کی ارزانی ہم کو یہ ساری توفیق؟
جس کا بھید نہ کھُل پائے وہ ایک سِرا تو پھر بھی ہے!
اس ساری تعمیر میں یعنی ایک خلا تو پھر بھی ہے!
ہستی کے اس کھیل کے پیچھے، ایک خُدا تو پھر بھی ہے!!"

○

گزُرے کل سا لگتا ہو جب آنے والا کل
ایسے حال میں رہنے سے تو بہتر ہے کہ چل

کرتی ہیں ہر شام یہ بِنتی، آنکھیں ریت بھری
روشن ہو اے امن کے تارے، ظُلم کے سُورج، ڈھل

اپنا مطلب کھو دیتی ہے دِل میں رکھی بات
رونا ہے تو کھُل کے رو اور جلنا ہے تو، جل

لمحوں کی پہچان یہی ہے، اُڑتے جاتے ہیں
آنکھوں کی دہلیز پہ کیسے ٹھہر گیا، وہ پَل!

عشق کے رستے لگ جائیں تو لوگ بھلے چنگے
ہوتے ہوتے ہو جاتے ہیں، دیوانے، پاگل!

موسم کی سازش ہے یا پھر مٹی بانجھ ہوئی!
پیڑ زیادہ ہوتے جائیں، گھٹتا جائے پھل!

جُھکی جُھکی آنکھوں کے اُوپر بوجھل پلکیں تھیں
لیکن کیسے چُھپ سکتا تھا! کاجل ہے کاجل!

زور آور کے دستِ ستم میں دونوں گِروی ہیں
مزدوروں کا خُون پسینہ، دہقانوں کا ہَل!

بُجھتے تاروں کی جِھلمل میں اوس لرزتی ہے
امجد دُنیا جاگ رہی ہے تُو بھی آنکھیں مَل

○

خُود اپنے لیے بیٹھ کے سوچیں گے کِسی دِن
یُوں ہے کہ تجھے بھُول کے دیکھیں گے کِسی دِن

بھٹکے ہُوئے پھرتے ہیں کئی لفظ جو دل میں
دُنیا نے دیا وقت تو لکھّیں گے کِسی دن

ہِل جائیں گے اِک بار تو عرشوں کے دَر و بام
یہ خاک نشیں لوگ جو بولیں گے کِسی دن

آپس کی کسی بات کا مِلتا ہی نہیں وقت
ہر بار یہ کہتے ہیں کہ "بیٹھیں گے کِسی دن!"

اے جان تری یاد کے بے نام پرندے
شاخوں پہ مرے درد کی اُتریں گے کِسی دن؟

جاتی ہے کِسی جھیل کی گہرائی کہاں تک!
آنکھوں میں تری ڈوب کے دیکھیں گے کِسی دِن

خُوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
اِک نظم ترے واسطے لکھیں گے کِسی دِن

سوئیں گے تری آنکھ کی خلوت میں کسی رات
سائے میں تری زُلف کے جاگیں گے کِسی دن!

صحرائے خرابی کی اسی گردِ سفر سے
پُھولوں سے بھرے راستے نِکلیں گے کِسی دن

خُوشبو کی طرح ، مثلِ صبا ، خواب نما سے
گلیوں سے ترے شہر کی گزُریں گے کسی دن

امجدؔ ہے یہی اب کہ کفن باندھ کے سر پر
اُس شہرِ ستم گار میں جائیں گے کسی دن!

○

خواہش کی کسی موج کے ریلے میں رہیں گے
شبنم کی طرح، صُبح کے میلے میں رہیں گے!

دیکھے گی زمیں، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک، لوگ، جھمیلے میں رہیں گے

مر جائیں گے ہم تم تو، مگر گیت ہمارے
اے دوست رواں، وقت کے بیلے میں رہیں گے

موجود تو ہوں گے مگر احساس کی صُورت!
خُوشبو کی طرح رنگ کے میلے میں رہیں گے

آنکھوں میں اُتر آئے گی اندر کی اُداسی
امجد جو یونہی آپ اکیلے میں رہیں گے!

○

دَرد ِ دل کا جہاں رواج نہیں
ایک انبوہ ہے، سماج نہیں

اے غمِ ہجرِ یار، یہ تو بتا
کیا تجھے کوئی کام کاج نہیں!

وہ ہے ہرجائی، یہ بجا، لیکن
دِل بھی تو مستقل مزاج نہیں

تیرے غم کے سِوا زمانے میں
کون سے دَرد کا علاج نہیں!

حِرص کھا جاتی ہے غریب کا رِزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں

تیری آنکھوں سی، دوسری آنکھیں
شاید ہوں گی کبھی، پر آج، نہیں

مملکت حُسن سی نہیں کوئی
عشق سا کوئی تخت و تاج نہیں

ق

کون سی آنکھ ہے تہی تجھ سے!
کون سے دل پہ تیرا راج نہیں!

اے خُدا، اے مرے ہُنر کے خُدا
اور کچُھ میری احتیاج نہیں!

بستیوں کو نہ پستیوں میں رکھ
التجا ہے یہ، احتجاج نہیں

○

رات کی سیج خالی ہے
دیکھ ، وہ صبح ہونے والی ہے!

میرے دل سے تری نگاہوں تک
درد نے راہ کیا نکالی ہے!

ہے پرے حدِ آسمان سے کیا؟
سب فضا اپنی دیکھی بھالی ہے

کہہ رہی ہے چمک ستاروں کی
درد کی رات ڈھلنے والی ہے!

جو نہ کہنی تھی بات، کہہ آئے
اور جو کہنی تھی وہ چھُپالی ہے

اِک طرف دل تھا، اِک طرف دُنیا
ہم نے دونوں سے سُر ملالی ہے

آنکھ والوں کے واسطے، منظر
ایک روزن ہے، ایک جالی ہے!

پھر وہی آنسوؤں کی بارش ہے
پھر وہی دل کی خشک سالی ہے!

پھیلتی جارہی ہے قوسِ قزح
دل پہ کِس نے نگاہ ڈالی ہے

دوستوں کا وہ دوست ہے امجد
نام جس کا جمیل عالی ہے

نظم

آندھیوں کی بے ٹھکانہ منزلوں میں
ریت ٹیلے ہو گئے
بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرتے کرتے
آپ نیلے ہو گئے

○

افلاک کا سایا ہے جو کچھ بھی زمیں پر ہے
ہے خواب کہیں میرا، تعبیر کہیں پر ہے

کچھ ایسی نظر ڈالی ہنگامِ وداع اُس نے
میں خُود تو چلا آیا دل اب بھی وہیں پر ہے

اے فکرِ سماواتی، اے طائرِ لاہُوتی!
پرواز سے کیا حاصل! جو کچھ ہے زمیں پہ ہے

"موجود" میں رہنے سے "آئندہ" نہیں ملتا
اثبات کا ہر جلوہ موقوف "نہیں" پر ہے

اُس لمحے کے جادُو سے پھر وقت نہیں نکلا
جو چیز جہاں پر تھی وہ چیز وہیں پر ہے

چاہے تو یونہی رکھے، چاہے تو سَحر کر دے
اِس رات کا مُستَقبل اُس ماہ جبیں پر ہے

اِس عُمر کی فرُصت میں ہر چیز کا ہونا ہے
جنّت بھی یہیں ہو گی! دوزخ جو یہیں ہے

○

کرتا ہُوں جمع میں تو بکھرتی ہے ذات اور
باقی ہے کتنی اے مرے مولا، یہ رات اور!

لیتی ہے جلتی شمع بھی بُجھنے میں کچھ تو وقت
ہے آدمی سا کوئی کہاں بے ثبات اور!

سیلاب جیسے لیتا ہے دیوار کے قدم
کرتا ہے غم بھی دل سے کوئی واردات اور

یوں تو حضور پاکؐ کے لاکھوں ہیں مدح خواں
تائبؔ سی لکھ رہا ہے مگر کون، نعت اور!

مظہر، ازل کے حُسن کے امجدؔ ہیں بے شُمار
لیکن جو دیکھئے تو ہے بارش کی بات اور

ا۔ حفیظ تائب

میں نے دیکھا اُسے

میں نے دیکھا اُسے ،
اجنبی سی کسی ایک محفل میں، میری طرح
وہ بھی ہونٹوں پہ اِک بے اِرادہ تبسم سجائے ہُوئے
ایک کونے میں بیٹھی کبھی اپنے ناخن ،
کبھی سامنے نیم خالی پڑے جامِ مشروب کو
اور کبھی میز کی آڑ میں
اپنی نازک کلائی پہ باندھی ہُوئی وہ گھڑی دیکھتی تھی
جسے آگے چل کر ......
مگر یہ تو سب بعد کے واقعے ہیں

ابھی تو اُسے اِس تکلّف بھری اجنبی بزم میں
غالباً
میری موجودگی کی خبر، میرے ہونے کا احساس تک بھی نہ تھا!
میزباں تھا کوئی یا کوئی اور ہی مہرباں تھا!
کہ جس نے ہمیں ایک دُوجے کے نام
اور ان کے کناروں سے لپٹے ہُوئے کچھ حوالے بتائے
کسے یہ خبر تھی کہ اُس سرسری سے تعارف کا وہ
ایک پَل، ایک ایسے تعلّق کی تمہید ہے
جو ہمارے لیے ....
مگر یہ بھی سب بعد کی بات ہے!

تو پھر یوں ہُوا
اپنی اپنی اُداسی کی شالوں میں لپٹے ہوئے، دیر تک
ہم وہیں ایک کونے میں بیٹھے رہے،

پھر کسی نے ڈنر کے لیے سب کو آواز دی
اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ، کھانا
بہت پُرتکلف تھا اور میزبانوں
کے حُسنِ مدارات کے ساتھ اُن کے تموّل کا بھی ترجماں تھا ، مگر
وہ کسی اور ہی سوچ میں دیر تک
اِک منقّش رکابی اُٹھائے ہُوئے ایستادہ رہی ،
میں نے اُس کے لیے
میز کے سامنے اِک جگہ سی بنائی اور اُس کی طرف
دوستانہ تبسم سے دیکھا کہ وہ
آگے بڑھ کر رکابی میں کچھ ڈال لے !
اُس نے آدابِ محفل میں لپٹی ہُوئی
مُسکراہٹ سے مجھ کو نوازا مگر ، آگے آئی نہیں ،
ایک لمحے کو جب میری اُس کی نگاہیں ملیں
تو مجھے یوں لگا ، جیسے وہ

اپنی ان خوشنما جھیل سی خواب آنکھوں میں
پھیلی اُداسی، ... . چھپاتے چھپاتے بہت تھک چکی ہو

سبز قہوے کے دَور اور اقبال بانو کی مسحور کُن
دِل نشیں گائیکی سے مہکتی ہُوئی اُس فضا میں وہ یوں
بے تعلّق سی بیٹھی رہی، جیسے وہ اُس گھڑی،
واں پہ تھی ہی نہیں

میں نے اُس سے کہا، ......
او خُدا! یہ تو پھر بعد کی بات ہے!
اُس گھڑی تو فقط میں نے چاہا کہ اُس سے کہوں
کچھ کہوں! اُس کو بتلاؤں
"اے اجنبی ہم نشیں
اس اُداسی کو کچھ دیر کے واسطے بھُول جا، مُسکرا

دیکھ ، دُنیا میں غم کے سوا بھی بہت کُچھ ہے ، آنکھیں
فقط آنسوؤں کے لیے ہی نہیں خواب بھی
ان کی جاگیر ہیں !
دیکھ میری طرف !
مجھ سے بھی زندگی نے ہمیشہ رقیبوں سا ہی
ایک رشتہ رکھا
میں نے بھی آج تک اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھی نہیں
سنگ و خشتِ تمنّا چُنے ہیں سدا
بخدا ، کوئی تعمیر دیکھی نہیں !"

رات ڈھلنے لگی ،
اور آہستہ آہستہ کمرے سے مہمان گھٹنے لگے ،
میزبانوں کے ہونٹوں کے لفظ
الوداعی مصافحوں کی یکسانیت میں بکھرتے ہوئے

اپنی گرمی سے محروم ہوتے گئے
اور باہر سے آتے ہوئے شور کی
دُور ہوتی صداؤں کے ہنگام میں
میزبانوں سے کچھ بات کرتے ہوئے
اُس نے دیکھا مجھے"۔اُس کے ہونٹوں کے کونے ذرا کپکپائے
وہ جیسے کسی نیند میں مُسکرائی،
چلی، پھر رُکی - رُک کے دیکھا مجھے!

ہاں یہی وہ نظر تھی
یہی وہ مقدّر بداماں نظر تھی
جو میرے لیے، صرف میرے لیے تھی
کہ جس میں اُلجھ کر
مری زندگی کی،
مرے آنے والے شب و روز کی

اور مرے سارے خوابوں کی منزل نہاں تھی
زمان و مکاں کے سبھی فاصلے
ایک پل کے لیے بے نشاں ہو گئے
اُسی اِک نظر میں دُھواں ہو گئے
پھر نہ میں تھا کہیں اور نہ کچھُ اور تھا
بس ازل تا ابد ایک خوشبو رواں تھی
فقط وہ ___ وہاں تھی!

خدشہ

گزرے لمحوں کی اُلجھی ہُوئی ڈور کے اُس طرف
خواب میرے جہاں دفن مٹی میں تھے
بارشوں نے وہاں گھاس اِتنی اُگا دی
کوئی رہنما سی علامت ، نشانی کوئی ، کچھ بچا ہی نہیں ،
کچھُ بچا ہی نہیں کہ کِسی یاد کی
کوئی اُلجھی ہُوئی اِک گرہ کھولتے !
وہ سِرا ڈھونڈتے !
ایک بھیدوں بھرا اور زمانوں پہ پھیلا ہُوا
وہ سِرا ڈھونڈتے
جو کہیں خواب اور اُس کی تعبیر کے درمیاں کھو گیا !

ہو چکی ہیں بہت، ہجر کی بارشیں
دن بہت جا چکے !
خواب میرے جہاں دفن مٹی میں ہیں
اب وہاں ہر طرف گھاس ہی گھاس ہے
اور اس گھاس میں سرسراتا ہُوا
سانپ سا ایک ڈر ہے ،
کہیں یہ نہ ہو !
ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سِرا مل بھی جائے !
وہ گِرہ کھُل بھی جائے !
تو لمحوں کی اُلجھی ہُوئی ڈور کے اُس طرف
کچُھ نہ ہو —— !!!"

کسی خُوش نگاہ سی آنکھ نے .....

کِسی خُوش نگاہ سی آنکھ نے یہ کمال مُجھ پہ کرم کیا
مری لوحِ جاں پہ رقم کیا
وہ جو ایک چاند سا حرف تھا وہ جو ایک شام سا نام تھا
وہ جو ایک پھُول سی بات پھرتی تھی دربدر
اُسے گلستاں کا پتا دیا
مرا دل کہ شہرِ ملال تھا اُسے روشنی میں بسا دیا
مری آنکھ اور مرے خواب کو کسی ایک پل میں بہم کیا ۔

مِرے آئنوں پہ جو گرد تھی مہ و سال کی
وہ اُتر گئی
وہ جو دُھند تھی مِرے چار سُو وہ بکھر گئی
سبھی رُوپ عکسِ جمال کے
سبھی خواب شامِ وصال کے
جو غبارِ وقت میں سَر بسَر تھے اَٹے ہُوئے
وہ چمک اُٹھے
وہ جو پھُول راہ کی دُھول تھے، وہ مہک اُٹھے،
لیے سات رنگ بہار کے
چلا میں جو سنگ بہار کے!
تو سجا دیئے سبھی راستے،
کِسی دستِ شعبدہ ساز نے
مِرے نام پر، مِرے واسطے!

مری بے گھری کو پناہ دی، مری جستجو کو نشاں دیا
جو یقین سے بھی حسین ہے مجھے ایک ایسا گماں دیا

وہ جو ریزہ ریزہ وجود تھا
اُسے اِک نظر میں بہم کیا
کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے
یہ کمال مجُھ پہ کرم کیا!!

○

شمارِ گردشِ لیل و نہار کرتے ہُوئے
گزُر چلی ہے ترا انتظار کرتے ہُوئے

خُدا گواہ ، وہ آسُودگی نہیں پائی
تمھارے بعد کسی سے بھی پیار کرتے ہوئے

اَزل سے یونہی چلی آرہی ہے یہ دُنیا
اِسے نہال اُسے بے قرار کرتے ہُوئے

تمام اہلِ سَفر ایک سے نہیں ہوتے
کھُلا یہ وقت کے دریا کو پار کرتے ہوئے

ق

عجب نہیں کبھی گزُرے ترے خیال کی رَو
مِرے گمان کے طائر شکار کرتے ہُوئے

کہیں چُھپائے مرے سامنے کے سب منظر
مجھے ، مجھی پہ کبھی آشکار کرتے ہُوئے

کِسے خبر ہے کہ اہلِ چمن پہ کیا گزری !
خزاں کی شام کو صبحِ بہار کرتے ہُوئے

ہَوس کی اور لُغت ہے وفا کی اور زباں
یہ راز ہم پہ کھُلا ، انتظار کرتے ہُوئے

عجیب شے ہے محبّت کہ شاد رہتی ہے
تباہ ہوتے ہوئے اور غبار کرتے ہُوئے

ق

جو ہو سکے تو کبھی میرؔ جی سے یہ پُوچھیں
یہ جان اُن کی غزل پر نثار کرتے ہُوئے

یہ کارخانہ اگر سر تا پا توہم ہے ؟
تو لوگ کیسے جئیں، اعتبار کرتے ہوئے

ہمارے بس میں کوئی فیصلہ تھا کب امجدؔ!
جُنوں کو چُنتے، وفا اختیار کرتے ہُوئے!

○

دو گھڑی دِل کا حال سُنتا جا
اے مِرے خُوش جمال سُنتا جا

عِشق کی خُود سُپردگی کو دیکھ!
عقل کی قِیل و قال، سُنتا جا

یہ اماوس کی آخری شب ہے
داستانِ ملال، سُنتا جا

"من نہ کردم، شما حذر بکنید"
زندگی کا مآل، سُنتا جا

تجھ سے کرنا نہیں جواب طلب
آخری اِک سوال سُنتا جا

گونج ہیں ٹوٹتے ستاروں کی
سب عُروج و زوال سُنتا جا

تجھ پہ بیتی ہے جو بھی کہہ امجدؔ
کچھ مِرے حسبِ حال سُنتا جا

○

آئینوں میں عکس نہ ہوں تو حیرت رہتی ہے
جیسے خالی آنکھوں میں بھی وحشت رہتی ہے

ہر دَم دُنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے،
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں فرصت رہتی ہے

کرنی ہے تو کھُل کے کرو انکارِ وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

شہرِ سخن میں ایسا کچھ کر، عزّت بن جائے
سب کچھ مٹّی ہو جاتا ہے عزّت رہتی ہے

بنتے بنتے ڈھ جاتی ہے دل کی ہر تعمیر
خواہش کے بہروپ میں شاید قسمت رہتی ہے!

سائے لرزتے رہتے ہیں شہروں کی گلیوں میں
رہتے تھے انسان جہاں اب دہشت رہتی ہے

موسم کوئی خوشبو لے کر آتے جاتے ہیں
ہر پل دھیان دریچے میں اک صورت رہتی ہے

چاپ کوئی جو مڑ جاتی ہے دل دروازے سے
کیا کیا ہم کو رات گئے تک وحشت رہتی ہے!

دھیان میں میلہ سا لگتا ہے بیتی یادوں کا
اکثر اُس کے غم سے دل کی صحبت رہتی ہے

پھولوں کی تختی پہ جیسے رنگوں کی تحریر
لوحِ سخن پر ایسے امجدؔ شہرت رہتی ہے

○

جو بھی اُس چشمِ خُوش نگاہ میں ہے
حاکمِ وقت کی پناہ میں ہے

فرق سائل کی بے صدا میں کچھ!
یا کمی ظرفِ بادشاہ میں ہے؟

اُس کو اہلِ ہوس نہ سمجھیں گے!
لُطف جو فاصلے کی چاہ میں ہے

داستاں، شب کے جاگنے کی، رقم
آنکھ کے حلقۂ سیاہ میں ہے

حالتِ جنگ ہی میں رہتا ہے
جب سے دل دزد کی سپاہ میں ہے

نہیں وہ خواہشِ نجات میں بھی
جو کشش دامنِ گناہ میں ہے!

بے نیازی سہی طبیعت میں
دِلبری بھی تو اُس نگاہ میں ہے

رُوح بیدار ہوتی جاتی ہے
دل کسی روشنی کی راہ میں ہے

تیغِ دو دم سے بھی سوا خطرہ
حلقۂ قُربِ بادشاہ میں ہے

بہت آساں ہے مُدّعی ہونا!
جتنی مشکل ہے سب نباہ میں ہے

کیا یقیں ہو کسی پہ جب، امجدؔ
اپنا ہونا بھی اشتباہ میں ہے!

—

اے راندگانِ خاک!!

اُٹھو زمین سے اے راندگانِ خاک، اُٹھو!
خُدا نے سر جو دیے ہیں، اُنھیں اُٹھا کے چلو
تمام سجدے بشر پر حرام ہوتے ہیں
(بس ایک سجدہ ہے جائز جو اُس کو زیبا ہے)
اُٹھو زمین سے اے کشتگانِ دزد کہ اب
وہ بے کسی کے زمانے تمام ہوتے ہیں!!

یہ بے بسی کے وظیفے — یہ عاجزی کے وِرد
ازل سے آج تک کِس کے کام آئے ہیں!
حقوق گرتے نہیں کاسۂ گدائی میں
کبھی نہ بھیک کے ٹکڑوں پہ نام آئے ہیں!
اُٹھو زمیں سے، اُٹھاؤ سروں کو، دیکھو تو!
تمھارے واسطے کیا کیا پیام آئے ہیں!!

بھلے دنوں کی توقع میں جاگتی آنکھیں
بکھر گئیں اِسی مٹّی میں انتظار کے بعد!
جو خواب دیکھے ہیں صدیوں تمھارے آبا نے
جو تم بھی دیکھتے جاؤ گے رات دن یوں ہی
تمھیں بھی خواب ہی واپس ملیں گے اور وہ بھی
بڑی اذیّت و ذلّت، بہت پُکار کے بعد!

سو اب جو دیکھو تو زندہ حقیقتیں دیکھو
کہ جن کے سائے میں تم کو حیات کرنی ہے
گزارنے ہیں یہیں پر تمام آتے دن!
یہیں تمھارے عزیزوں نے رات کرنی ہے!
ہے سرّ حرمتِ آدم، زباں کی آزادی،
کرو اے بخت گزیدو جو بات کرنی ہے!!

اسلام آباد کی ایک سڑک

بُلند و بالا، وسیع و عریض، پُر ہیبت
یہ سنگ و خشتِ تراشیدہ سے بنے ایواں!
یہ جگمگاتی ہُوئی کھڑکیوں کے رنگِ رواں!
وہ بُت کدے ہیں جہاں،

ہر اِک غرض کے لیے ایک دیوتا ہے الگ
سب اپنی اپنی مہارت میں مختلف ہیں مگر
ہے سب کی ایک سی صُورت، ہے سب کی ایک زباں
برائے خلقِ خدا سب ہیں یک دل و یکساں

جو کوئی غور سے دیکھے عجب تماشے ہیں!
کسی کے کام نہ آئیں یہ وہ دلاسے ہیں!
یہ لوگ پانی میں رکھے ہُوئے بتاشے ہیں!

یہیں پہ بٹتی ہے امن وسکون کی دولت!
یہیں شجاعت وصدق وصفا کے مکتب ہیں
یہیں پہ رہتا ہے اہلِ دُعا کا مستقبل
یہیں ہے عدل کی کُرسی، یہیں مناصِب ہیں!
یہاں زمیں کا سِرا آسماں سے ملتا ہے
سوائے خیر کے، سب کچھ یہاں سے ملتا ہے!!

○

دِل کو حصارِ رنج و اَلم سے نکال بھی
کب سے بکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی

آہٹ سی اُس حسین کی ہر سُو تھی، وہ نہ تھا
ہم کو خُوشی کے ساتھ رہا اِک ملال بھی

سب اپنی اپنی موجِ فنا سے ہیں بے خبر
میرا کمالِ شاعری، تیرا جمال بھی

حُسنِ اَزل کی جیسے نہیں دُوسری مثال
ویسا ہی بے نظیر ہے اُس کا خیال بھی!

مت پُوچھ کیسے مرحلے آنکھوں کو پیش تھے
تھا چودھویں کا چاند بھی، وہ خُوش جمال بھی!

جانے وہ دن تھے کون سے اور کون سا تھا وقت!
گڈمڈ سے اب تو ہونے لگے ماہ و سال بھی!

اِک چشمِ التفات کی پیہم تلاش میں
ہم بھی اُلجھتے جاتے ہیں، لمحوں کا جال بھی!

دنیا کے غم ہی اپنے لیے کم نہ تھے کہ اور
دل نے لگا لیا ہے یہ تازہ وبال بھی!

اِک سرسری نگاہ تھی، اِک بے نیاز چُپ
میں بھی تھا اُس کے سامنے، میرا سوال بھی!

آتے دنوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ کھُلے
سب کچھ فنا کا رِزق ہے ماضی بھی حال بھی!

تم دیکھتے تو ایک تماشے سے کم نہ تھا
آشفتگانِ دشتِ محبّت کا حال بھی!

اُس کی نگاہِ لُطف نہیں ہے، تو کچھُ نہیں
امجدؔ یہ سب کمال بھی، صاحبِ کمال بھی!